© rasailojaraid.com

ڈاکٹر نذیر احمد

انسانی اجتماعی زندگی کا ارتقا

مولانا روم کی عظیم مثنوی میں دفتر چہارم کے اخیر میں ہم کو مندرجہ ذیل قابل ذکر اشعار ملتے ہیں:

آمدہ اول با قلیم جماد — وز جمادی در نباتی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد نادر وز نبرد
وز نباتی چوں بحیوانی فتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں — خاصہ در وقت بہار و ضمیران
باز از حیواں سوئے انسانیش — می کشد آں خالقے کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

ان اشعار کا منظوم ترجمہ مولوی فیروز دین صاحب نے یوں کیا ہے:

پہلے آیا سوئے اقلیم جماد — پھر نباتی میں رہا وہ شاد شاد
مدتوں اندر نباتی کے رہا — کچھ جمادی کی نہ یاد آئی ذرا
جب نباتی سے وہ حیوانی ہوا — کچھ نباتی سے نہ یاد اس کو رہا
تھوڑا سا میلان ہے بس یادگار — آتی ہے جب فصلِ ریحان و بہار
آیا پھر حیوان سے انسان میں — دیں اسے خالق نے اپنی جنبشیں
اس طرح وہ ہر ولایت میں پھرا — اور اب دانا و عاقل ہو گیا

ان اشعار میں مولانا نے اجمالی طور پر زندگی کے ارتقا کا خاکہ کھینچا ہے جو جمادی اشیا سے شروع ہو کر ایک اقلیم سے دوسری اقلیم میں گذرتی ہوئی انسان تک پہنچی ہے۔ یہ نکتہ کہ عاقل و دانا انسان کا مرد و بے جان مادے سے ارتقا کا تعلق ہے بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ان اشعار کے معانی پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان میں شاعرانہ مبالغہ نہیں۔ بلکہ اپنی خداداد فراست سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا ایک جست لگا کر اس حقیقت کی تہ کے نزدیک پہنچ گئے ہیں جس کی طرف دور حاضر کی سائنس بہ تفصیل رہنمائی کرتی ہے۔ موجودہ دریافت شدہ علم کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی جمادات میں سوتی ہے، نباتات میں خواب دیکھتی ہے، حیوانات میں خفیف جنبش کرنے لگتی ہے اور انسان میں بیدار ہو جاتی ہے۔

فطرت آشفتہ کہ از خاک جہان مجبور
خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد (اقبال)

زندگی کی ابتدائی کیفیت

جہاں تک بے جان مادے کا تعلق ہے جس کو عام طور پر زندگی سے عاری سمجھا جاتا ہے، اس کا اگر ہم غور سے مطالعہ کریں تو اس میں کئی خاصیات ایسی پائی جائیں گی جن کا عموماً جاندار اشیا سے ربط ہوتا ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ اگر انسان یا حیوان سخت مشقت کا کام کرے یا کسی کام میں دیر تک لگا رہے تو وہ تھکن محسوس کرے گا۔ لیکن یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ بے جان مادہ خصوصاً دھاتوں کی صورت میں موثر طریقے میں تھکن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر ہم ایک لانبی اور پتلی سلاخ کو کسی دھات کے تار سے لٹکا کر مستقل طاقت کے زیر اثر افقی سطح میں اہتزاز کرائیں تو اس کی حد اہتزاز بتدریج کم ہوتی جائے گی جیسے کہ وہ مجبوراً وہی کام مسلسل کرنے سے تھک گئی ہے۔ دھاتوں میں تھکن کا مشاہدہ اس سے بھی زیادہ موثر طریقے پر یوں دیکھا جا سکتا ہے کہ اگر ہم کسی دھات کے ٹکڑے کو ہاتھ میں لے کر دونوں طرف جلدی جلدی موڑیں تو وہ تھوڑی دیر میں بالکل ویسے ہی چٹ سے ٹوٹ جائے گا جیسے کہ کوئی انسان یا حیوان، جس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا جائے، جسمانی یا دماغی لحاظ سے شکست مان لے۔

نشوونما کی مشابہت

ان مظاہر کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑی سی احتیاط سے کام لے کر ہم پانی میں حل شدہ متعدد دھاتوں کے بے جان نمکوں سے اس صورت کی قلمیں بنا لیں جن کی پانی میں اگے ہوئے پودوں سے اتنی حیرت انگیز مشابہت ہو کہ نظر دھوکا کھا جائے۔ اس طرح جاندار اشیا کی دو مشہور خاصیتیں یعنی تخلیق کا تکرار اور بنیادی خلیوں کی باقاعدہ ترتیب ان بے جان قلموں میں ہم کو صاف طور پر نظر آتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقلیم نباتات

جب ہم نباتات کی اقلیم تک آتے ہیں تو اس سوال میں کہ آیا حیوانوں کی طرح ان میں زندگی پائی جاتی ہے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ زندگی کی جو عام طور پر جانی پہچانی خاصیتیں ہیں مثلاً خوراک کا ہضم کرنا، نسل بڑھنا، سانس لینا، زوال پذیر ہوتے ہوتے مرجانا وغیرہ۔ وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ پودے کئی ایسی خاصیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں جن کا تعلق عام طور سے حیوانات سے سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً روشنی کی طرف منہ کرنا، بارور یا بانجھ ہونا، وغیرہ۔ البتہ حیوانات کی طرح وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک بالارادہ حرکت نہیں کرسکتے۔ نہ ہی وہ ایسی ہم جنس برادریاں بناسکتے ہیں جو مل کر باہمی مدد سے ترقی کریں۔ نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ اکٹھے ہو کر کسی مشترک دشمن کا مقابلہ کریں۔ ان خصوصیتوں کا تعلق بالخصوص حیوانات سے ہے۔

اقلیم حیوانات

جن خاصیتوں کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے اور جو نباتات میں نہیں پائی جاتیں، ان کا مظاہرہ اول اول، ابتدائی کیفیت میں، مچھلیوں، رینگنے والے جانوروں اور پھر اس سے ترقی یافتہ شکل میں کیڑے مکوڑوں، پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہاں ہم پہلی مرتبہ اتحادِ عمل اور باہمی تعاون کی ان قوتوں کو کارفرما دیکھتے ہیں جن کی بنا پر چھوٹے یا بڑے گروہ اکٹھے ہو کر زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں، جو باہمی فائدے کے لیے کردار کے بعض اصول وضع کر لیتے ہیں، جو خوراک اور غذا مہیا کرنے کے لیے منظم طریقے اختیار کرتے ہیں، دشمنوں کے مقابلے میں متحدہ مدافعت پیش کرتے ہیں، گھونسلوں اور چھتوں کی شکل میں حفاظتی مسکن بناتے ہیں، تلاشِ غذا، مدافعت اور تعمیر مسکن میں تقسیم محنت کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ ان میں سے بعض انواع خصوصاً کیڑے مندرجہ بالا مشترک کاموں میں قابلِ ذکر ہنر اور اچھی خاصی فراست کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاہم اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے بہت سے کام اس قسم کے تکراری اعمال ہیں جو تجربہ کی بنا پر حاصل کرنے کی بجائے نسلاً بعد نسلٍ ان کے ورثہ میں آتے ہیں۔ ان میں اس بات کی اہلیت نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنے آپ کو تغیر پذیر حالات [illegible] بدلتے ہوئے گردونواح کے مطابق جلدی سے بدل لیں۔ چونکہ ان میں گفتار اور تحریر کا سلیقہ نہیں آیا، اس لیے ان میں اس بات کی اہلیت بھی ایک محدود درجہ تک پائی جاتی ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک نسل اپنے تجربات کے نتائج سے آئندہ نسلوں کو آگاہ کرسے۔ اس طرح باہمی تعاون کا انتظام ایک حد تک پہنچ کر رک جاتا ہے اور اس سے آگے ترقی نہیں کرتا۔

انسانی معاشرہ کی خصوصیات

جن خصوصیات کا ہم نے ابھی ابھی اوپر ذکر کیا ہے وہی وہ خصوصیات ہیں جن کے لحاظ سے انسانی معاشرہ حیوانات سے بمقابلہ اس درجہ کے زیادہ مختلف ہے جس درجے سے حیوانات نباتات سے مختلف ہیں۔ اس زیادہ درجۂ اختلاف کی جو انسانوں اور حیوانوں کے درمیان بمقابلہ حیوانوں اور نباتات کے درمیان واقع ہے، بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان دن بدن اپنی عقل اور شعور سے زیادہ کام لیتا ہے۔ غرض اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سلسلۂ مخلوقات کے ایک سرے یعنی جمادات سے شروع ہو کر جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں زندگی کے ہر موڑ پر نئی خصوصیات میں ملتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پرانی خصوصیات، جو ارتقا کے دوران حاصل کی گئی تھیں وہ برقرار رہتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اردگرد دنیا کی لاتعداد اشیا کی صورت، شکل، شباہت، جسامت، ماہیت، وغیرہ کی دلآویز بوقلمونی کے زیر زبر زندگی کا ایک ایسا رشتہ ہے جو برابر وسیع تر ہوتا رہتا ہے جو ان سب اشیا کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے، ان میں آپس میں تعلق پیدا کرتا ہے، اور ان سب کو ایک ایسے ہار کی شکل میں پرو دیتا ہے، جس کے مرکز میں انسان سب سے زیادہ قیمتی اور روشن زیور کی شکل میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ہے زندگی کے ارتقا کی مختصر سرگزشت،

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی (اقبال)

عقل کا دور

ہر چند انسان کا خمیر مادّے سے اٹھا ہے جس کی جاندار خاصیتوں میں وہ حصہ دار ہے، تاہم مقابلتہً تھوڑے عرصے میں وہ اپنی عقل کے استعمال اور نشوونما سے دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے۔ اس موازنے میں وہ حیوان بھی شریک ہیں جو حیاتیاتی ارتقا میں اس سے قریب ترین ہیں۔ دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں اس کی شاندار ترقی کئی طرح سے عیاں ہے۔ مثلاً اس نے کئی جمعیتیں ایسی بنائی ہیں جن کا نظام کافی پیچیدہ ہے۔ اس نظام کو چلانے کے لیے اس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوانین اور دستور العمل تیار کیے ہیں جن کی بنا پر مرکزی حکومت اور اس کے مختلف ادارے کھڑے کیے ہیں۔ اس نے ولولہ انگیز نغمے اور شعر ترتیب دیے ہیں اور دیگر فنونِ لطیفہ کے شاہکار تخلیق کیے ہیں۔ اس نے فطرت کے قانون دریافت کیے ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے مشینیں اور نئے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ اس نے زمین کی پیداوار بڑھائی ہے اور بیماری اور وبا کی روک تھام کی ہے۔ اور اب وہ اس پر آمادہ نظر آتا ہے کہ زمین کی جکڑبند کشش سے آزاد ہو کر فضا میں ایک جست لگاتا ہوا اجرامِ فلکی تک پہنچ جائے؛

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک (اقبال)

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں مجملاً ان کمالات کا، جو انسان نے انفرادی یا اجتماعی طور پر فہم و فراست کی مدد اور استعمال سے حاصل کیے ہیں ذکر کرنا اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ عقل و دانش کی بجائے جنون اور دیوانگی اور جذب و مستی کا ڈنکا بجایا جائے اور ان کو ہر موقع پر، خصوصاً پُراثر شاعری میں سراہا جائے۔ اگر ٹھنڈے دل اور غور سے دیکھا جائے تو گزشتہ چند صدیوں میں انسان نے جتنی ترقی کی ہے وہ زیادہ تر اس کی عقل، تدبیر اور فہم و فراست کی کارفرمائی کی بنا پر ہے اور اس لیے مناسب ہے کہ اس دور کو عقل کا دور کہا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس حد تک انسان جذبات اور شہوات کی بجائے عقل سے کام لیتا ہے اسی حد تک وہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، جن کی زندگی زیادہ تر جذبات اور شہوات پر مبنی ہے۔

تغیر اور مطابقت

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں ان چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممیز کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلی تو یہ ہے کہ انسان اپنے جسمانی اور دماغی قویٰ کو عمداً اور ایک منظم طریقے کے ماتحت استعمال کر کے اور فطرت کے وسائل اور قوتوں کو تسخیر کر کے ماحول کو بدلتا ہے اور دوسری یہ کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کا چیلنج قبول کر کے خود اپنی ذہنیت اور کردار میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ یعنی وہ ان بدلتے ہوئے حالات اور ماحول سے مخالفت رکھنے کی بجائے مطابقت رکھنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کوشاں رہتا ہے۔ اس کے برخلاف نباتات اور حیوانات میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ ان کی جانب سے ارادی اور کسی منصوبے کے ماتحت نہیں ہوتیں بلکہ یا تو وہ کسی زبردست طوفان یا ہیجان کا نتیجہ ہوتی ہیں یا فطری انتخاب کا۔ انسان کے متعلق ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کا اطلاق افراد پر تو ہمیں آسانی سے نظر آسکتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جب دیہاتی لوگ بڑے شہروں میں آبستے ہیں تو وہ تھوڑی دیر میں اپنے عادات اور اطوار بدل لیتے ہیں۔ یا جب گرم ملکوں کے باشندے سرد ممالک میں سکونت پذیر ہوتے ہیں تو ان پر بھی یہی ماجرا گزرتا ہے۔ اس تبدیلی میں یقیناً وہ خارجی ذرائع مثلاً لباس، گرمی، یا سردی پہنچانے کے آلات وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں بے کار ہیں جب تک کہ وہ اس بات پر رضامندی سے آمادہ نہ ہوں کہ اپنے بیرونی حالات اور اندرونی واردات میں انقلاب پیدا کریں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس لحاظ سے بعض افراد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دلیر اور چست ہوتے ہیں اور بعض لوگ زیادہ ڈرپوک اور کم لچک۔ تاہم انفرادی طور پر لوگوں نے یہ حقیقت تسلیم کر لی ہے کہ اس کرۂ زمین پر تغیر اور تبدیلی قدرت کا محرک اور بنیادی اصول ہے، اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو برضا و رغبت قبول کیا جائے۔ اگر ہم تغیر کو معیوب سمجھیں، اور مسلسل بدلتی ہوئی دنیا میں اپنا اندرونی جائزہ لیے بغیر ایک ہی ڈگر پر زندگی بسر کریں تو یہ روش فطرت کے بنیادی اصول کے خلاف ہوگی، اور اس طرح ہم گویا اس تمام تحریک سے انکار کریں گے جس کی کارفرمائی سے بے جان مادّے سے انسان کا ارتقا ہوا، اور جو زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں (غالب)

اجتماعی کردار

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے جہاں تک افراد کا تعلق ہے تغیر کی ناگزیری اور اس کے چیلنج کی مثبت قبولیت آسانی سے نظر آجاتی ہے۔ لیکن جہاں تک ایک بڑے انسانی گروہ جیسے کسی قوم یا ملت کا تعلق ہے تغیر کا احساس اور اس سے مطابقت بسا اوقات دشوار اور مخفی ہوتی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ افراد کے مقابلے میں قوم میں اجتماعی جمود کا میلان زیادہ ہوتا ہے، اور دوسرے یہ کہ ہر قوم میں اس کے افراد کی مختلف اغراض اور رائیں ہوتی ہیں جو بعض وقت تو مخلصانہ اور بعض وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود غرضانہ نیتوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان وجوہات سے قطع نظر ہر قوم کے لیے بہ حیثیت مجموعی یہ امر لازمی ہے کہ وہ تغیر کی ضرورت اور ناگزیریت کو اچھی طرح سمجھ لے اور بجائے اس کے کہ وہ ماضی کی گرفت میں، خواہ وہ کتنی ہی شاندار رہ چکی ہو، اندھا دھند قید رہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس دور میں وہ زندگی بسر کر رہی ہے اس کے تقاضوں سے اچھی طرح آگاہ ہو کر ان کے مطابق اپنے آپ کو دماغی اور جسمانی لحاظ سے بدلنے پر آمادہ اور راضی رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مستقل خود نگری و جہان بینی کا سلسلہ جاری رکھے جس کی بنا پر ایک طرف تو وہ ان خارجی اثرات کو قبول کرے جو اس کے لیے مفید ہوں اور دوسری طرف ان باطنی کمزوریوں کو رفع کرے جن سے اسے نقصان پہنچ رہا ہو۔ صرف وہی اقوام دنیا میں ترقی کر کے دوسری اقوام کے دوش بدوش اپنی مناسب جگہ لے سکتی ہیں جو اس قسم کی ذہنیت رکھتی ہیں اور ان کے برخلاف جو اقوام ہر قسم کے تغیر کی مخالف ہوں وہ نہ صرف پس ماندہ رہ جائیں گی بلکہ عجب نہیں کہ چند صدیوں میں ان کی داستان صرف کتابوں اور عجائب گھروں میں محفوظ رہ جائے اور ان پر یہ شعر صادق آئے کہ:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ (سرور)

تغیّر کا رخ

تبدیلی اور تغیر عالمی فطرت کا اصل اصول سہی لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر تبدیلی اور تغیر مناسب اور بجا ہو۔ اس وقت ہم نیکی اور بدی، روا اور ناروا، کی اخلاقی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے لیکن اتنا تو ہم فی الفور دیکھ سکتے ہیں کہ عالمی فطرت میں بعض تغیر اور حادثات ایسے ہوتے ہیں جن میں خیر سے شر کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی دریا کا اپنی گزرگاہ کا بدلنا، آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا، ٹڈی دل کا نباتات پر گزرنا وغیرہ ایسے حادثات ہیں جن سے فائدے کی نسبت نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عالمِ انسانی میں کئی ایسے رجحانات اور کردار ہیں مثلاً رشوت خواری، دھوکے بازی، بد دیانتی، دروغ گوئی وغیرہ کہ جب وہ دیانت داری، حق گوئی، وفاداری وغیرہ کی جگہ لے لیتے ہیں تو بے پناہ نقصان کرتے ہیں۔ جب اس قسم کی تبدیلی صرف چند افراد کے کیریکٹر میں آئے تو وہ یقیناً بری تو ہے تاہم اس کا برا اثر محدود درجہ تک رہتا ہے اور اس کا ازالہ ان نیک ہستیوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چال چلن سے ہو جاتا ہے جو ان برائیوں کے سنہری دام میں نہیں آتیں۔ لیکن جب ایک قوم کی اکثریت یا خاصی بڑی اقلیت ان برائیوں پر ریاکاری یا زمانہ سازی کے پردے میں عمل پیرا ہو جائے تو بلا شک و شبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قوم میں بہت بڑا تغیر واقع ہوا ہے۔

قومی شخصیت

اس ضمن میں یہ نکتہ غور کے قابل ہے کہ قوم محض اس کے افراد کی مجموعی تعداد کا نام نہیں بلکہ ان خیالات اور افعال کے مرتب اور منظم ہونے کی وجہ سے جن کا سلسلہ سالہا سال چلتا ہے اس کی ذہنیت میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی اپنی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور جس کی وجہ سے اس کی ایک خاص شخصیت بن جاتی ہے۔ مثلاً جب ہم قدیم یونانیوں کا تصور کرتے ہیں تو معاً ہمارے ذہن میں فلسفیانہ تخیل، انسان دوست ذہنیت اور فنون لطیفہ سے انسیت کے خیالات ابھر آتے ہیں کہ یہ اس قوم کی روشن خصوصیات تھیں۔ اس کے برخلاف جب ہم یہودیوں کا تصور کرتے ہیں تو ہمارا ذہن روپے پیسے کا لالچ، عیاری اور تنگ نظری کی طرف مائل ہوتا ہے جو من جملہ اور چیزوں کے اس قوم کی تاریک خصوصیات ہیں۔
عام طور پر اس قسم کی قومی خصوصیات کو متشکل ہونے میں کافی عرصہ لگتا ہے لیکن بعض متوقع خصوصیات جبری حالات مسلسل پروپاگنڈا اور زیر نگرانی تعلیم کے ذریعے مقابلۃً کم عرصے میں بروئے کار لائی جا سکتی ہیں۔ جہاں اس قسم کے زود اثر تغیر کی محرک قوتیں قوم کی فلاح و بہبود اور حاکموں کی ذاتی بے غرضی ہو وہاں شاندار کامیابی اور اچھے نتائج تھوڑی مدت میں سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن جہاں محرک قوتیں ذاتی غرض اور طاقت کی ہوس ہوں وہاں کسی قوم کی روح، ذہنیت اور مفاد کو تھوڑی مدت میں سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں دونوں قسم کے تغیرات کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا مضمون کے احاطہ سے باہر جاتا ہے۔ اصولی بات جو غور کرنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ افراد کی طرح اقوام کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ان میں برابر تغیر پیدا ہوتا رہے اور بشرطیکہ یہ تغیر معیوب شکل میں نہ ہو۔ اس کی مخالفت کرنا دانائی اور پیش بینی کے منافی ہوگا البتہ اگر کوئی آدمی یا گروہ کسی تغیر کی مخالفت کرنا ضروری سمجھے تو اس مخالفت کی بنا پر صرف اسلاف کی اندھا دھند تقلید اور توہم پرستی پر نہیں ہونا چاہیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیوں کہ اس سے تو ایسا دماغی جمود پیدا ہو جائے گا جو کسی قوم کے لیے نہایت خطرناک امر ہے منتقل ارتقا کے لیے اس قسم کے دماغی جمود سے پرہیز لازمی شرط ہے، اور ایسے دماغی جمود سے بچ کر ہی ایک قوم اس ترقی کی معراج پر پہنچ سکتی ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

جس روز افزوں تیزی سے انسان ترقی کر رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بنی نوع انسان نے اپنی تہذیب کا خاتمہ خود اپنے دریافت کردہ آلات کے غلط استعمال سے نہ کر دیا تو دورِ آئندہ کا انسان فیضی کا ہم نوا ہو کر کہہ سکے گا:

من دفترِ کون و مکاں یک یک مفصل دیدہ ام
اوراقِ تقویمِ فلک جدول بجدول دیدہ ام
لوحِ ازل بکشادہ ام سرِّ ابد دانستہ ام
تفسیرِ ہستی کردہ ام آیاتِ منزل دیدہ ام

© rasailojaraid.com